Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:10 (1967)
© rasailojaraid.com

انتخاب

دینی اور دنیوی علوم اور قدامت پسندی و جدت پسندی

☆ جسٹس ایس اے رحمٰن

(۲۸ جنوری ۱۹۶۷ء کو پنجاب یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں سپریم کورٹ پاکستان کے جج جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب نے کانووکیشن خطبہ پڑھا، اس خطبے کے کچھ اقتباسات نیچے دیئے جاتے ہیں ۔ مدیر)

ایک زمانہ ایسا تھا جب ہمارے نظامِ تعلیم میں مسجد و مدرسہ کی تفریق نہ تھی۔ اس وقت کے فارغ التحصیل دینی و دنیاوی دونوں قسم کے علوم پر عبور رکھتے تھے ۔ ریاست و معاشرہ کے سربرآوردہ لوگ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ہماری اخلاقی اور دینی اقدار سے بھی مضبوط رشتہ رکھتے تھے، لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور کل کے حاکم غیروں کے محکوم بن گئے ۔ اجنبی اقتدار کے تصادم سے جو تبدیلیاں آئیں، اُن سے ہماری معلومات میں بے شک اضافہ ہوا، اور صدیوں کے عقلی جمود کے بعد ہم علم و دانش کے ترقی پذیر نظریہ سے دوبارہ آشنا ہوئے، ساتھ ہی ساتھ ہمارے سماج میں انتشار پیدا ہوا ۔ ہمارے روایتی علوم کے علم بردار تو بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ گئے اور بدلتے ہوئے ماحول سے آنکھیں بند کر کے، الحاد کے تھپیڑوں کا مقابلہ طعن و تشنیع یا تکفیر کے فتوؤں سے کرنے لگے، دوسری طرف نوجوان نسل کی آنکھیں مغربی ثقافت کی سطحی دل فریبیوں سے ایسی چندھیائیں کہ ہر بات میں جدت پرستی کی روایت ان کا شعار بن گئی ۔ فقیہ و مُلّا کی ناخوش اندیشی نے انہیں دین بیزاری کی حدوں تک پہنچا دیا۔ ان دو طبقوں کے بُعد نے تعلیمی نظام پر بھی اپنا اثر ڈالا، اور بظاہر دو دبستانِ تعلیم ساتھ ساتھ جاری ہو گئے جن میں سے ایک دینی علوم کے لئے وقف تھا اور دوسرا دنیاوی علوم کا نام لیوا۔

یہ تقسیم و تفریق ملتِ بیضا کے مفاد کے منافی تھی اور ہے۔ اس مرض کا علاج یہی ہے کہ پُرانی قسم کے مدرسوں

© rasailojaraid.com

کے نصاب میں عصرِ حاضر کی ضرورتوں کے عکاس مضامین مثلاً تاریخ، اقتصادیات، عمرانیات، سیاسیات، مبادیات سائنس اور ایک آدھ غیر ملکی زبان شامل کئے جائیں، اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی اصولوں اور قدروں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ بے شک اس بارے میں اقدامات ہوئے ہیں۔ لیکن غالباً وہ ہمارے ملی مقاصد کی پیش رفت کے لئے ناکافی ہیں لازم ہے کہ کافی سوچ بچار کے بعد ان تمام کوششوں کو ایک منظم منصوبہ کے تحت لایا جائے تاکہ ذہنی افق کی وسعت کے ساتھ ساتھ قومی سالمیت کی اہمیت واضح ہوتی رہے۔

میں اس ضمن میں عرض کردوں گا کہ ہمارے اساتذہ اور ہمارے طلبہ دونوں میں تاریخی شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی سیاسی عمر زیادہ تو نہیں۔ لیکن اس کی ثقافتی عمر کافی طویل ہے اس کے پسِ منظر میں مسلمانوں کی چودہ سو سالوں کی تہذیب اور مدنیت ہے۔ ہمارا ملک ایک نظریاتی مملکت ہے جو اسلامی اقدار کی اساس پر قائم ہوا تھا۔ اور یہی اس کے وجود کا جواز تھا۔ ہماری قومی شخصیت تبھی نکھر سکتی ہے جب کہ ہماری نوجوان نسل کی جڑیں ہماری اپنی ثقافتی سرزمین میں مضبوط ہوں۔ بیسویں صدی میں اسلامی اصولوں کو اپناتے ہوئے ہمیں کسی معذرتی انداز کا سہارا نہیں چاہیئے اور نہ ہمیں کسی احساسِ کمتری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی ضرورت ہے۔ اسلامی قدریں درحقیقت آفاقی اور کائناتی قدریں ہیں۔ اسلام کا منتہیٰ ومقصود ملتِ انسانی کا قیام ہے۔ اس کے توحید اور مساوات کے عالم گیر اصول، نسل، رنگ اور زبان کی حدبندیوں سے بالا ہیں۔ اس کا حرکی تصورِ حیات جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ اور دنیا وعقبیٰ دونوں کی بہبود کا ضامن ہے۔ زمان ومکان کی تغیر پذیریاں ہمیں ہراساں نہیں کر سکتیں یہ تو حقیقت میں آیاتِ الٰہی ہیں اور ہم قرآن کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہر نئے مسئلہ کا حل دریافت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم قدامت پرستی اور تنگ نظری کا شکار نہ ہو جائیں، ہمیں اپنی اجتہادی بصیرتوں کو پھر سے بروئے کار لانا ہے تاکہ زندہ خدا کی ہر دم نئی شان، نئی آن کے تخلیقی تقاضے انسانوں کی دنیا میں پورے ہوتے رہیں۔

ہمارے معاشرے کا یہی وہ پہلو ہے جہاں ہمارے تعلیمی نظام کی صلاحیتیں آزمائی جائیں گی۔ اس صورت میں سائنسی علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ اقدارِ اسلامی کے شعور کا عام کرنا ہماری تعلیم کا ایک اہم جزو قرار پاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم میں سے ہر پڑھے لکھے فرد کو اپنے دین کی مبادیات یعنی قرآنی اصولوں سے واقف ہونا چاہیئے۔ علمِ دین پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری اسلام کی جمہوری روح کے منافی ہے کیونکہ یہ ایک قسم کی برہمنیت کی پرورش ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ایک نظریاتی مملکت میں بسنے والوں کی امتیازی خصوصیات غالباً شعورِ ذات، شعورِ کائنات اور شعورِ خالقِ حیات ہی سے تعبیر ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اسی ہمہ گیر شعور کے زریں تار کو اپنے

© rasailojaraid.com

تعلیمی تانے بانے میں سمو دینا چاہیئے اگر ہم نے اپنے نونہالوں کو اُن کے ثقافتی ورثے سے محروم رکھا تو وہ اس عالمی انتشار کے زمانے میں یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ جائیں گے۔

دنیا اس وقت ایک عظیم آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ نظریات کی سرد جنگ ہی سوہانِ روح نہیں بلکہ بعض خطوں میں قوموں کے درمیان مہلک جنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ اہلِ خرد دم بخود ہیں کہ ایک قسم کا توازنِ دہشت ہی اس آن امنِ عالم کا ضامن معلوم ہوتا ہے۔ ایٹمی توانائی کی دوڑ میں بڑے اور چھوٹے ملک ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ سائنسی علوم جن سے انسانی بہبود کی خاطر تسخیرِ کائنات کا کام لیا جانا تھا۔ شیطانی آلاتِ موت کے غلام بن رہے ہیں۔ اگر کسی ایک جانب سے کوئی قیامت خیز ایٹمی دھماکہ شروع ہوا تو ربعِ مسکوں کی دھجیاں فضائے بسیط میں اُڑتی ہوئی نظر آئیں گی اور یوں انسانی علوم کے شہ کار کا انسانی خودکشی کے لئے استعمال مسجودِ ملائک پر فطرت کا ایک بھرپور طنز بن جائے گا۔

انسانوں کی بستی اس وقت ایک روحانی بحران سے دوچار ہے۔ رُوحِ عصر پیچ و تاب میں ہے کہ کیسے اور کہاں سے وہ اسمِ اعظم ہاتھ آئے، جس کی برکت سے ذہنِ انسانی پر سے طاغوتی طاقتوں کا منحوس سایہ اُٹھ جائے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اس لادینی سیاست کا جس نے مغربی ممالک کو مدت سے اپنے چنگل میں گرفتار کر رکھا ہے۔ دنیا کے معاملات میں ذاتِ باری پر ایمان کے حیات افروز عنصر کا فقدان ہی قافلۂ زندگی کو اس نازک موڑ پر لے آیا ہے۔ مغرب میں ان تاریخی عوامل کے زیرِ اثر جس ذہنیت کی تربیت ہو رہی ہے، اس کا پَرتو ادب و فن پر بھی پڑا ہے اور قنوطیت، کلبیت، عریانیت اور انتشار کی چھاپ ان پر لگ چکی ہے۔ تاہم یہ بات کسی قدر دلچسپی کا باعث ہے کہ مغرب کی لادریت کی تہ میں شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر، ایک دین کے لئے اضطراب کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ دورِ حاضر کے وجودی مصنفین کی تحریروں میں صلیب اور کفارہ کی علامتوں کا استعمال اس حقیقت کا غماز ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہمارے اکثر ذکی نوجوان مصنفین بھی پیروی مغرب کر کے اسی منفی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ یہ بات تشویش انگیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی مثبت نظریۂ حیات سے دور ہوتے جا رہے ہیں، جس کی پیدا کردہ مدنیت کی تعریف علامہ اقبالؔ نے ان لفظوں میں کی ہے ؎

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

ہمارے مغرب زدہ نوجوان بھول گئے ہیں کہ مغرب کے یہ ذہنی کوائف ان کے مخصوص حالات کا ثمرہ ہیں اور بغیر

© rasailojaraid.com

ان تجربات سے گزرے جو مغربی اہل قلم کے حصہ میں آئے۔ ان کے فکری نظام کو اپنا لینا ادبی خلوص کا منہ چڑانا ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ہمارے اکثر ذہین فارغ التحصیل یہ روش اختیار کر رہے ہیں تو یہ بھی ہمارے ادارۂ تعلیم کی ایک نوع کی ناکامی ہے۔ تعلیمی اداروں کا تعلق معاشرہ سے بہت گہرا ہوتا ہے کیوں کہ تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس سے انفرادی کردار اجتماعی شخصیت دونوں کی تربیت ہوتی ہے۔ مثالی حالات میں مدرسہ اقدار حیات کے مشترک اجتماعی ذخیرہ کو نئی نسل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ جماعتی نظریہ کی وضاحت کرنا اور اس کو گہرائی بخشنا اس کا وظیفہ ہے۔ ایک حد تک یہ روایات اور ثقافت حاضرہ کا ناقد بھی ہے، تاکہ صالح اور غیر صالح عناصر میں تمیز ہو سکے۔ تعلیمی تجربہ ان تاریخی تجربات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، جو اور زمانوں اور مکانوں میں ہو چکے ہیں۔ لیکن اس تجربہ کی روح مادی و ذہنی اجتماعی ماحول سے بیگانہ نہیں ہو سکتی، یہی روح معاشرہ کے مقاصد کا آلۂ کار ہے، خالص دانش پروری مدرسہ کے ادنیٰ مقاصد میں سے ہے۔ اس کا اعلیٰ مقصد تو سیرت کی تعمیر ہے، جس کا تعلق ذہن سے زیادہ قلب و نظر سے ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

یہ دل و نظر کی رفاقت تعلیم سلیم ہی سے میسر آسکتی ہے، جس کی بنیاد کسی عظیم نصب العین پر رکھی گئی ہو۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں ایک عظیم نصب العین اسلامی اقدارِ زندگی کی صورت میں عطا ہوا ہے، جس کے ساتھ دین و دنیا دونوں کی بھلائی وابستہ ہے۔ ہم اس گراں بہا اثاثہ کو نفی حیات کی قیمت پر ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔

کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ (للامام محمد بن حسن الشیبانیؒ)

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی اور ان کی مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد کے ارکان کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام سرخسیؒ اور امام طحاویؒ وغیرہ کی نادر و نایاب تصنیفات کو دنیا بھر کے کتب خانوں سے تلاش کر کر کے شائع کیا۔ اور ائمہ احناف کے جن نادر خزانوں کو متاخرین احناف کی کتابوں نے چھپا دیا تھا وہ علم و تحقیق کی روشنی میں دنیا کے سامنے آگئے۔ چنانچہ ابھی ابھی اسی ادارہ نے امام محمدؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ" کی پہلی جلد چھاپ کر شائع کی ہے۔